سِیَر یا قانون بین الممالک

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

دو خود مختار سیاسی وحدتوں کے تعلقات جن قواعد کے تحت جاری رہتے ہیں، ان کو مسلمان فقہاء نے (عربی میں) "سِیَر" کا نام دیا تھا (جو "سیرۃ" کی جمع اور جس کے معنے طرز عمل اور برتاؤ کے ہیں۔) قدیم زمانے میں اسے "قانون بین القبائل" کا نام دے سکتے تھے۔ پھر شہری مملکتوں کے زمانے میں اسے بین البلدیات کہہ سکتے تھے۔ ایک زمانے میں جب "قوم" کا مفہوم سیاسی تھا نسلی نہیں، بین الاقوام کی اصطلاح کا اس پر اطلاق ہو سکتا تھا۔ اب اسے بین الممالک یا بین الدوّل کے سوا کوئی اور نام نہیں دے سکتے۔

اس پس منظر سے معلوم ہوگا کہ سِیَر کا وجود انسانی سماج میں زمانہ ما قبل تاریخ سے ہو چکا ہونا چاہیئے۔ لیکن تاریخی نقطۂ نظر سے ان "قواعد" کے نہیں بلکہ ان "قواعد کے علم" کے موجد پہلی اور دوسری صدی ہجری کے مسلمان فقہاء ہیں۔ دو وجوہ سے یہی استنباط کرنا پڑتا ہے۔

(۱) مسلمان ہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے علم سِیَر کے قواعد کا اطلاق عالمگیر کر دیا۔ اور دنیا کی کسی بھی قوم یا مملکت کو اس سے مستثنیٰ نہ رکھا۔ قدیم ترین قوموں میں سے (۱) آریائی برہمنوں کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ان کے ہم مذہب، ہم زبان اور ہم تمدن مگر ایک دوسرے سے خود مختار برہمنی مملکتوں میں تو باہمی جنگ و امن کے تعلقات معینہ قواعد کے تحت رہیں گے۔ لیکن باقی دنیا کو جسے ملیچھ کا نام دیا گیا تھا، اچھوت قرار دے کر منو سمرتی وغیرہ کے تحت جانوروں سے بھی بدتر درجے تک پہنچا دیا گیا تھا۔ ان بے چارے مفتوحوں کا سایہ بھی کسی برہمنی مذہب والے پر پڑ جائے تو اسے نہانے کی ضرورت ہو۔ ان سے برتاؤ میں صرف صوابدید کی ہر آن بدل سکنے والی چیز پر عمل تھا۔ (۲) بنی اسرائیل کو توریت نے یہ تعلیم دی کہ جس اجنبی شہر کے سامنے وہ پہنچیں اور وہ خوشی سے اطاعت کرے تو وہاں والوں

---

* یہ مقالہ بین الاقوامی اسلامی [illegible] لئے پیرس سے آیا تھا (مدیر)

کو جان کی تو امان رہے گی. لیکن وہ بنی اسرائیل کے غلام اور خدمت گار بنیں گے۔ اور اگر مقابلے کے بعد وہ مغلوب ہو تو وہاں والوں میں سے مقاتلوں کو قتل، عورتوں، بچوں کو غلام اور مال و متاع کو غنیمت بنایا جائے گا. اس "رعایت" سے بھی عمالقہ قبائل (جو فلسطین کے عربی النسل باشندے تھے) مستثنیٰ تھے۔ ان میں سے کسی ذی روح کو زندہ نہ چھوڑا جائے۔ عورت مرد ہی نہیں دودھ پیتا بچہ بھی، بلکہ اونٹ بکری، بیل اور گدھا تک قتل کر دیا جائے۔ (دیکھو توریت میں کتاب تثنیہ نیز اشموئیل پیغمبر کی کتاب اوّل)۔ (۳) یونانی تصوّر ارسطو طالیس وغیرہ کے مطابق یہ تھا۔ جزیرہ نمائے یونان میں بسنے والی ہم مذہب، ہم زبان اور ہم تمدن یونانی شہری مملکتوں میں تو باہمی جنگ و امن میں معینہ قواعد کا اطلاق ہوگا. باقی دنیا کے لئے جسے بربر (یعنی بربریت پسند) کا نام دیا گیا تھا، کوئی حق نہیں پایا جاتا تھا. "فطرت نے انہیں یونانیوں کا غلام بننے کے لئے پیدا کیا ہے"۔ اور ان کے متعلق یونانی اپنی صوابدید پر جو چاہے عمل کر سکتے تھے۔ (۴) رومی دور میں نسلی تنگ نظری سے تو نجات ملی لیکن دنیا کو تین حصوں میں بانٹا گیا. رومی سلطنت اور دوست اور حلیف ممالک اور باقی دنیا۔ حلیفوں کے ساتھ حالت امن میں تو معینہ قواعد کے مطابق سلوک ہوتا لیکن باقی اجنبی ممالک نیز سابق حلیف ملک سے جنگ کی صورت میں سوائے صوابدید کے کوئی معین قواعد نہ تھے۔ (۵) یورپ اور امریکہ میں ۱۸۵۶ء تک قانون "بین المسیحیین" پر عمل تھا اور کسی غیر عیسائی کے لئے کوئی "حق" نہیں تسلیم کیا جاتا تھا. پوپ چوتھے نکولاس کے مطابق تو کسی غیر عیسائی کو دیئے ہوئے قول کی پابندی مذہبی نقطۂ نظر سے کسی عیسائی پر واجب نہیں بلکہ عہد شکنی ہی بہتر ہے۔ ۱۸۵۶ء میں پیرس کانگرس میں جب ترکی سے ایک معاہدہ کرنا پڑا تو مجبوراً یہ قرار دیا گیا کہ مغربی قانون بین الملک کے اصول و احکام کا اطلاق ترکی پر بھی مساوات کے اصول پر ہوگا۔ اس تاریخ کے بعد رفتہ رفتہ جاپان وغیرہ غیر عیسائی ممالک صریح معاہدوں کے ذریعے متمدن ممالک کے زمرے میں داخل کئے جاتے رہے۔ حالیہ جنگِ عظیم تک یہ اصول رہا کہ "متمدن" ممالک میں آپس کے برتاؤ میں تو قواعد معین ہوں گے لیکن غیر متمدن سے، جس سے مراد عملاً یہ تھا کہ جو استعمار پرست مغربی حملہ آوروں کے خلاف اپنی مدافعت کے قابل نہ ہو، سوائے صوابدید کے کسی اور اصول پر عمل کی ضرورت نہیں۔ اب مجلس اقوام متحدہ میں اصول یہ ہے کہ جس جدید امیدوار کو اقوام متحدہ کے موجود الوقت ارکان اپنی اکثریت سے قبول کریں اور اس کی مجلس تحفظ کا کوئی مستقل رکن

اس کے خلاف نہ ہو تو اسے اقوام متحدہ کا رکن بنایا جا سکتا ہے، ورنہ نہیں۔ بہرحال مغرب میں اب تک کسی ملک کو اس کے اپنے حق کی بنا پر "متمدن" تسلیم نہیں کیا جاتا بلکہ یہ فریق ثانی کی مرضی پر منحصر ہے۔ اس کے برخلاف چودہ سو برس ہوئے اسلام نے اپنے آغاز ہی سے یہ اصول قرار دیا کہ ساری غیر مسلم یعنی اجنبی دنیا کے ساتھ برتاؤ کے قواعد معین ہیں۔ صوابدید یا اصول شکنی کی کسی صورت میں اجازت نہیں۔

(۲) مسلمانوں سے قبل مختلف قوموں میں اجنبیوں سے جنگ و امن کے برتاؤ کا ذکر تو ملتا ہے لیکن یہ برتاؤ علم سیاست کا جزو تھا اور نصیحت الملوک یا شہزادوں کی درسی کتابوں میں ان سے بحث ہوتی تھی۔ قانون کی کتابوں میں نہیں۔ بین الممالک تعلقات کے قواعد کا ذکر میرے علم میں اسلام سے پہلے مستقل علم کے طور پر کبھی نہیں ہوا۔ مسلمانوں نے یا تو اس پر خصوصی کتابیں لکھیں یا ان کو قانون (فقہ) کی کتابوں میں ایک باب کے طور پر درج کیا۔ دوسرے الفاظ میں یہ قواعد اسلامی قانون کا جزو تھے۔ مسلمان حاکم کی صوابدید کا مسئلہ نہیں۔ غرض مسلمانوں نے اسے قانون بھی بنایا۔ بین الممالک و عالمگیر بھی اور ایک مستقل علم بھی۔

آغاز

یہ کہنا تو دشوار ہے کہ سب سے پہلے کس مسلمان فقیہ نے علم سِیَر سے بحث کی۔ صحابہ کرام کو چھوڑ بھی دیں تو علقمہ نخعی، ابراہیم نخعی، حماد، ابن سیرین وغیرہ کی کتابیں اب نہیں ملتیں۔ زید بن علی زین العابدین کی وفات ۱۲۰ھ میں ہوئی (۱۲۲ھ بھی بیان کی جاتی ہے) ان کی کتاب "المجموع فی الفقہ" البتہ مل گئی اور چھپ گئی ہے۔ اس میں کتاب السیر کے عنوان سے ایک خاصا طویل باب ہے اور مسلمانوں کی خانہ جنگیوں ہی سے نہیں بلکہ اجنبی غیر مسلم ممالک سے جنگ اور صلح کے قواعد سے بحث کرتا ہے۔

امام ابوحنیفہ انھیں کے ہمعصر تھے، معتقد اور شاگرد بھی کہے جا سکتے ہیں۔ بنی امیہ کے آخری حکمرانوں کی ستمگری سے عاجز ہو کر انھوں نے دامے درمے سخنے قلمے انقلاب کی مدد کی۔ چنانچہ زید بن علی کی مسلح کوشش کے وقت انھوں نے بڑی رقم کا چندہ بھی دیا تھا۔ معلوم نہیں ٹھیک کس تاریخ کو بہرحال بروایت ابن حجر انھوں نے ایک مستقل "کتاب السیر" لکھی، جس میں علاوہ اور

قواعد جنگ و امن کے اس نکتے سے بحث تھی کہ "لاطاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق" (حدیث: خالق کی نافرمانی کے لئے مخلوق کی اطاعت نہ کی جائے) یعنی بغاوت شرعی نقطۂ نظر سے کب جائز ہے؟ اس خطیر علمی رائے زنی یا فتوے پر بڑا ہنگامہ مچا۔ ایک طرف تو امام ابوحنیفہ کو عراق چھوڑ کر حرم حجاز میں پناہ گزین ہونا پڑا۔ دوسرے ان کی کتاب کی کئی لوگوں نے تردید لکھی۔ امام اوزاعی کی کتاب اس بارے میں سب سے مشہور ہے۔ امام مالک کی "کتاب السیر" بھی ایسی ہی ہونی چاہیئے۔ کیونکہ لکھا ہے کہ بعض وقت عشاء کی نماز کے بعد سے فجر کی نماز تک دونوں اماموں میں مسجد نبوی میں علمی مباحثہ ہوتا رہا۔ امام مالک کی کتاب اب لاپتہ ہے لیکن امام اوزاعی کی کتاب کے نہ صرف اقتباسات ملتے ہیں بلکہ اس کا جواب جو امام ابو یوسف نے "الرد علی سیر الاوزاعی" کے نام سے لکھا تھا، وہ موجود ہے اور چھپ بھی چکا ہے۔ ان سب کے بعد امام شافعیؒ کا زمانہ آیا اور عباسی دَور میں انھوں نے اپنی کتاب الام میں اس مباحثے پر مفصل تبصرہ کیا ہے۔ چنانچہ وہ اولاً ابوحنیفہ کی رائے نقل کرتے ہیں۔ پھر اس پر اوزاعی کی تنقید۔ پھر ابو یوسف کا جواب اور آخر میں اپنی ذاتی رائے دیتے ہیں۔ اور مسئلہ بہ مسئلہ سارے اقتباسات یا اختلافی مباحث اس طرح درج کرتے ہیں۔

اس دَور کے بعد ہمیں سِیَر پر دو طرح کا مواد ملتا ہے۔ ایک تو مستقل کتابیں مثلاً امام محمدؒ کی "کتاب السیر الصغیر" اور "کتاب السیر الکبیر"۔ مذکورہ بالا ائمہ کے علاوہ زفر، ابراہیم الفزاریؒ واقدی وغیرہ بھی اس موضوع پر کتابیں لکھتے ہیں اور اب فزاری کی کتاب کے ٹکڑے اور واقدی کے اقتباسات ملتے ہیں۔

دوسرے فقہ کی عام کتابوں میں کتاب السیر کے عنوان سے ہمیشہ ایک مستقل باب قانون بین الممالک کے متعلق نظر آتا ہے: سنّی کتابوں میں بھی شیعہ اور خارجی کتابوں میں بھی۔ اور جیسا کہ اوپر اشارہ ہوا۔ اس صورت حال کو بڑی اہمیت ہے کیونکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ مسلمان بین الممالک تعلقات کے قواعد کو اپنے قانون ملک کا جزو سمجھتے ہیں، محض صوابدید کی چیز نہیں۔ جو حکمران اور سپہ سالار اپنی مرضی سے بدل سکیں۔ اور جب کوئی چیز قانون ملک کا جزو ہوتی ہے تو اس کی خلاف ورزی پر عدالت اور قاضی کے ہاں فریاد کی جا سکتی اور داد چاہی جا سکتی ہے، چاہے مظلوم دشمن اجنبی ہی کیوں نہ ہو۔ قانون بین الممالک کا اتنا بلند تصور مغرب میں آج تک نہیں آسکا ہے۔

اسلامی قانون بین الممالک کی ایک واقعاتی اہمیت یہ ہے کہ مسلمان چونکہ بحر الکاہل (PACIFIC) سے بحر الظلمات (ATLANTIC) تک صدیوں حکمران رہے۔ اور تین برّ اعظموں پر اپنے بے شمار غیر مسلم ہمسایوں سے برتاؤ میں انہیں قواعد پر عمل کرتے رہے، اس لئے قوانین کا باہمی تاثر ناگزیر تھا۔ اسلامی قانون چونکہ زیادہ ترقی یافتہ اور انسانیت پرور تھا اس لئے اس کی تاثیر بھی زیادہ رہی۔ میں نے اپنی حقیر انگریزی تالیف (MUSLIM CONDUCT OF STATE) میں ایک مفصل باب میں اس سے بحث کی ہے کہ جدید مغربی قانون بین الممالک کس حد تک اسلامی قانون اور مسلمانوں کے طرز عمل سے ماخوذ اور متاثر ہے۔ یہاں اس اشارے پر اکتفا کرتا ہوں۔

مندرجات

قانون بین الممالک کی اب دو بڑی قسمیں ہوگئی ہیں: عمومی اور خصوصی۔ عمومی میں ان قواعد سے بحث ہوتی ہے جن کے تحت ایک حکومت کے تعلقات دوسری حکومت اور اس کی رعایا سے جنگ اور امن میں جاری رہتے ہیں۔ خصوصی میں اجنبی رعایا کے تعلقات مسلمان رعایا کے ساتھ بتائے جاتے ہیں۔ اس آخر الذکر کو عباسی دور کے فقہاء نے تہارج کا نام دیا تھا۔ اسے آج کل تصادم قوانین (CONFLICT OF LAWS) کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے مباحث میں اہم تر یہ ہوتا ہے کہ فریقین مقدمہ کے اپنے اپنے قانون میں احکام مختلف ہوں تو فیصلہ کس کے قانون کے مطابق کیا جائے؟ اسلامی قانون میں نکاح ایک معاہدہ ہے اور (طلاق کے ذریعے سے) قابل تنسیخ مگر عیسائی مذہب کے لحاظ سے نکاح ایک مقدس فعل (SACRAMENT) اور ناقابل تنسیخ چیز ہے۔ لہذا ایک عیسائی کنبے کے مرد کے مسلمان ہو جانے کی صورت میں اگر نومسلم شوہر طلاق دے تو اس کے مقدمے کا فیصلہ کس فریق کے قانون کے مطابق کیا جائے؟ بہرحال تفصیلوں میں گئے بغیر عرض کرنا یہ ہے کہ قدیم اسلامی کتب سِیَر میں عمومی اور خصوصی دونوں قسم کے قانون ہائے بین الممالک کا یکجا ذکر ہوتا رہا ہے۔

اساس

اپنوں سے کسی ملک میں قانون ملک ہی کے ذریعے برتاؤ ہوتا ہے۔ صرف پرایوں کے لئے سِیَر کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن کسے اپنا اور کسے پرایا سمجھا جائے؟ اس بارے میں ہر تمدن کا اصول الگ رہا ہے۔ اوپر تمہید

میں اس کی تاریخ اور ارتقا بیان ہوا۔ آج کل مغرب میں زیادہ تر جغرافی یعنی سیاسی قومیت کارفرما ہے۔ نسل، زبان اور مذہب کو قانوناً کم ہی اہمیت ہے۔ جمہوریہ جنوبی افریقہ میں نسلی یا رنگی قومیت ہے۔ کالی رعایا درجۂ دوم کے شہری قرار دیئے گئے ہیں۔ جمہوریۂ اسرائیل میں نسلی قومیت براج رہی ہے۔ عیسائی اہلِ ملک درجہ دوم کی اور مسلمان اہلِ ملک درجہ سوم کی رعیت ہیں۔ اور یہودی چاہے دنیا کے کسی ملک میں رہتے ہوں، خود بخود اسرائیل کی رعیت بھی سمجھے جاتے ہیں۔ گویا ان اجنبی یہودیوں کو مرکب یا دُہری قومیت حاصل ہوتی ہے۔ روس میں صرف اشتراکی درجہ اوّل کی رعیت ہیں اور ذمہ داری کے عہدوں پر فائز ہو سکتے ہیں (پارلیمنٹ کی رکنیت ہو کہ وزارت کسی غیر اشتراکی رعیت کو نہیں دی جا سکتی)۔ غیر اشتراکی باشندگانِ ملک خاص کر مسلمانوں کو اپنے مذہبی قانون پر عمل کی اجازت نہیں۔

اس کے برخلاف مسلمان فقہاء نے اپنے دورِ عروج میں مطمح نظر (آئڈیالوجی) کو سیاسی و ملّی ربط کا اصول قرار دیا۔ یعنی سارے مسلمان ایک قوم ہیں اور سارے غیر مسلم ایک دوسری قوم لیکن مسلمان اپنے قانون پر اور غیر مسلم اپنے اپنے قانون پر عمل کریں۔ نتیجہ یہ ہے کہ سِیَر (قانون بین الممالک) کی کتابوں میں مسلمانوں نے "اپنوں" سے بحث صرف بغاوت اور خانہ جنگی کی صورت میں کی اور "پرایوں" میں نہ صرف اجنبی غیر مسلم سلطنتوں اور ان کی رعایا سے بحث کی بلکہ خود اسلامی مملکت کی غیر مسلم رعایا (ذمیوں) سے بھی۔

اس میں غیر مسلموں کا فائدہ ہی فائدہ ہے کیونکہ قرآن مجید کے صریح احکام کے تحت ہر مذہبی گروہ کو قانونی، دینی اور سماجی امور کی حد تک خود مختار رہنے کا حق ہے۔ دو عیسائیوں میں دیوانی یا فوجداری جھگڑا ہو تو "ولیحکم أھل الانجیل بما أنزل الله فیه" (المائدہ: ۴۶) کے تحت ان کا مقدمہ اسلامی مملکت کی عیسائی عدالت میں عیسائی جج کے سامنے اور عیسائی قانون کے مطابق چلتا ہے۔ اسلامی قانون کا ان پر اطلاق نہیں ہوتا۔ یہی حال ہر مذہبی گروہ یہودی اور پارسی وغیرہ کا ہے۔ عیسائیوں میں فرقہ پرستی اور ان میں کثیر باہمی اختلاف کی بنا پر خلافت راشدہ میں یہ حل نکالا گیا کہ خصوصی فرقہ وار عدالتوں کی جگہ ہر فرقے کے پادریوں اور کلیساؤں کو عدالتی اختیار بھی دے دیئے جائیں۔ (اگر فریقین مقدمہ مختلف مذہبوں یا ایک ہی مذہب کے مختلف فرقوں کے ہوں تو فریقین ہی یہ طے کرتے تھے کہ کس ثالث سے رجوع کریں۔ عموماً مسلمان کا انتخاب

ہوتا رہا ہوگا)۔

اسلام تبلیغی مذہب تو ہے لیکن دین قبول کرنے میں جبر و اکراہ کو قرآن نے ممنوع قرار دیا ہے۔ غیر مسلموں کے لئے ذمّی (یعنی زیرِ حفاظت اور ذمہ داری سے مستفید شخص) کا نام بے معنی نہیں۔ انھیں اپنے دین اور اپنے تمدن سے استفادے کی آزادی رہتی ہے۔ مسائل قانونِ شخصی، نکاح، طلاق وراثت وغیرہ کے ہوں، یا سماجی و معاہداتی۔ ان پر اسلامی قانون عائد نہیں کیا جاتا۔ سیَر میں چونکہ اجنبیوں سے بحث ہوتی ہے، اس لئے ذمّیوں کو ناگزیر اس کا موضوع قرار دیا گیا اور یہ صراحت کی گئی کہ بیرون سے سیاحت وغیرہ کے لئے آنے والے اجنبی بھی اپنے ہم مذہب ذمّیوں میں داخل شمار کئے جائیں گے۔ مزید برآں ادنیٰ ملازمت سے لے کر وزارت تنفیذ تک سارے ہی عہدے غیر مسلموں کے لئے کھلے ہوئے ہیں جیسا کہ ماوردی، ابویعلی الفراء وغیرہ نے صراحت کی ہے خود رسول اکرمؐ نے عمرو بن امیہ ضمری کو سفیر بنا کر حبشہ بھیجا تھا۔" اور وہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔"

اس فراخدلی اور رواداری کا فائدہ یہ ہوا کہ اسلامی مملکتوں میں غیر مسلم رعایا کی بغاوتیں (ترکی میں مغربی تصوّر قومیت آنے سے قبل تک) تقریباً ناپید رہیں۔ خلافتِ راشدہ کی برق آسا فتوحات نے ۲۶ھ میں اسلامی فوجوں کو ایشیا، افریقہ اور یورپ کے تین برّاعظموں پر پہنچا دیا تو اس وقت مسلمان اقلیت ہی میں نہیں آبادی میں اقل قلیل تھے۔ اس کے دس سال بعد حضرت عثمانؓ کی شہادت کے سلسلے میں خانہ جنگی شروع ہوئی اور سالہا سال جاری رہی لیکن اس اثنا میں نہ سابق بیزنطینی (رومی) رعایا نے بغاوت کرکے آزادی حاصل کرنے کی کوشش کی اور نہ سابق ایرانی یا کسی اور رعایا نے۔ بلکہ بہ اتفاق مورخین یہ ذمّی مسلمانوں کی ماتحتی کو اپنے سابق ہم مذہبوں کی حکومت پر ترجیح دیتے رہے۔ یہی حال علی العموم اموی اور عباسی دَور کا رہا۔ اس کا راز یہی معلوم ہوتا ہے کہ ذمّیوں کو کامل داخلی خودمختاری حاصل رہی: عبادت و ضمیر کی بھی اور ثقافت اور عدل گستری کی بھی۔

شائد یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مغربی تصوّر قومیّت میں بنی نوع آدم کا تشتّت ہی روزافزوں ہوتا ہے۔ اسلامی تصوّر قومیّت میں متشتّت و متفرق اجزاء کے روزافزوں توحّد کی صورت پیدا ہوتی ہے۔

ماخذِ احکام

سیَر چونکہ فقہ کا ایک باب اور ایک جزو ہے، اس لئے اسلامی قواعدِ سیَر کے ماخذ اولاً وہی ہوں گے، جو فقہ کے ہیں۔ یعنی قرآن وسنت نیز اجتماعی یا انفرادی آراء فقہاء۔ لیکن عہدِ نبوی ہی سے اس سلسلے میں بین الممالک معاہدات کو ایک جائز اور واجب التعمیل ماخذ تسلیم کر لیا گیا (مثلاً صلح نامۂ حدیبیہ) ایسا ماخذ صرف فریقین معاہدہ میں کارفرما رہتا ہے اور صرف اس وقت تک جبکہ معاہدہ نافذ رہے۔ دیگر ممالک و اوقات کے لئے وہ ایک نظیر کا کام دیتا ہے۔

ایک اور ماخذ متقابل اثر (RECIPROCITY) ہے۔ مثلاً حضرت عمرؓ کا حکم سرحدی چنگی کے افسروں کے نام کہ غیر ممالک کے تاجر جو کچھ درآمد کریں تو ان سے اسی شرح پر چنگی وصول کی جائے جس شرح پر ان تاجروں کے وطن میں مسلمان تاجروں سے وصول کی جاتی ہے۔ امام محمدؒ نے یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کسی اجنبی ملک میں مسلمان تاجروں یا عورتوں پر چنگی معاف ہو تو مماثل برتاؤ وہاں کے تاجروں سے اسلامی سرزمین میں کیا جائے گا۔ اسی طرح استیمان (ویزا) کے قواعد بھی مساوات اور تعامل کی اساس پر مبنی رہے۔

مزید تفصیلوں میں گئے بغیر عرض کرنا یہ ہے کہ اس طرح اسلامی سیَر ایک منجمد اور غیر ترقی پذیر نظام بن جانے کی جگہ نشو ونما پانے اور ہر زمانے کی ضرورتوں کا ساتھ دینے کے قابل رہتا ہے۔ اور فقہاء خذ ما صفا دع ما کدر پر عمل کر سکتے ہیں۔

مؤیّدہ یا قوت نافذہ (SANCTIONS)

حضرت عمرؓ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے نام ہدایت نامے میں کیا خوب کہا ہے کہ "لا ینفع تکلّمٌ بحقٍّ لا نفاذ لہ" (اس حق سے فائدہ ہی کیا جو نافذ نہ کیا جا سکے)۔ دیگر قوانین کی طرح سیَر سے بھی حقوق اور واجبات دونوں پیدا ہوتے ہیں۔ فریق ثانی یعنی غیر مسلم مملکت کے نظام سے یہاں بحث نہیں۔ بتانا صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کے ہاں خاص کر سیَر کا نفاذ کن تہدیدات کے تحت ہوتا ہے۔

قانون کے نفاذ کے لئے حکومت کی مادی قوت محرکہ پہلی چیز ہے۔ پولیس، فوج اور دیگر مادی وسائل اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں۔ جب کوئی متضرر اسلامی عدالت سے رجوع ہوتا ہے تو وہ فریقین کو حاضر ہونے پر مجبور کرتی ہے۔ سماعت کے بعد فیصلہ کرتی اور اپنے حدودِ اختیار

(اسلامی مملکت) کے اندر اس کا نفاذ کرتی ہے۔ چاہے یہ فیصلہ مسلمان کے حق میں ہوا ہو یا غیر مسلم دشمن کے۔ نفاذ پر آمادہ یا مجبور کرنے والی دوسری چیز خدا اور عذابِ آخرت کا خوف ہے۔

صرف ایک مادی وسیلے کے مقابلے میں یہ مادی اور روحانی دوگونہ مؤیدۂ ظاہر ہے کہ زیادہ مؤثر ہے۔ اب زمانۂ حال میں اخبارات کے باعث دنیا میں فضیحت رائے عامہ کی طرف سے تقبیح اور مماثل امور کو بھی روز افزوں اہمیت حاصل ہوتی جا رہی ہے۔ بین الاقوامی عدالت انصاف ابھی طفولیت میں ہے۔ عدالت حقوق انسانی بے بس بھی ہے اور نااہلوں کے ہاتھ میں بھی ہے۔ مجلس اقوام متحدہ کو اس کے دستور نے معطل بنا رکھا ہے۔ لیکن ان ضمنی چیزوں میں چاہے مسلمان مملکتیں شریک ہوں، ان کی ایجاد کا سہرا ان کے سر نہیں۔

قانون بین الممالک کے احکام تین حصّوں میں تقسیم کئے جاتے ہیں: حالتِ امن، حالتِ جنگ اور حالتِ غیر جانب داری۔ یہاں چند اشاروں پر اکتفا کے سوا چارہ نہیں۔

خود مختاری اور اقتدار اعلیٰ (INDEPENDENCE AND SOVEREIGNTY)

غیر محدود آزادی کا دنیا میں وجود نہیں۔ کچھ قدرتی پابندیاں ہیں: بچّہ کتنا ہی چلّائے، ماں چاند کو توڑ کر اس کے ہاتھ میں نہیں دے سکتی۔ کچھ پابندیاں غیروں کے مماثل حق سے پیدا ہوتی ہیں: میرے لئے بے شک یہ ممکن ہے کہ جسے چاہوں قتل کروں۔ جس کا مال چاہوں چھینوں۔ لیکن اتنا ہی امکان ہر دوسرے شخص کو بھی میرے خلاف پایا جاتا ہے۔ مجبوراً یہ پابندی گوارا کرنی پڑتی ہے کہ نہ میں کسی شخص کو قتل کر سکوں اور نہ کوئی دوسرا مجھے۔ ان اصول کا اطلاق افراد ہی کی طرح مملکتوں پر بھی ہوتا ہے۔

مذکورہ قدرتی اور باہمی مفاد کی پابندیوں کے سوا معاہداتی پابندیاں بھی حکومتیں قبول کرتی ہیں۔ کبھی خوشی سے اور کبھی مجبوراً۔ ان سارے امور کا اطلاق بلاتفریق مذہب وملّت ساری انسانی حکومتوں پر ہوتا ہے۔

اصولاً دنیا میں صرف ایک اسلامی مملکت ہونی چاہیئے۔ جب سب کا کعبہ اور قرآن ایک ہے تو خلیفہ یا امام بھی ایک ہونا چاہیئے۔ لیکن اس کا امکان نظر آتا ہے کہ ایک سے زائد اسلامی مملکتیں وقت واحد میں پائی جائیں۔ مثلاً صحیح بخاری میں ذکر ہے کہ جب نجاشی کی وفات کی اطلاع آئی۔

تو رسول اللہؐ نے اس پر غائبانہ نماز جنازہ پڑھی۔ یعنی وہ مسلمان تھا لیکن وہ اپنے ملک میں عملاً خود مختار بھی تھا۔ چاہے وہ رسول اکرمؐ کو اپنا دینی ہی نہیں دنیوی پیشوا بھی مانتا ہو لیکن حبشہ کے نظم ونسق کے لئے مدینے سے احکام بھیجے جانے کا پتہ نہیں چلتا۔

نیم مختار مملکتیں بھی عہد نبوی میں نظر آتی ہیں۔ عمان (جنوب مشرقی عرب) میں جلندی کے دو بیٹوں جیفر اور عبد کی مشترکہ حکمرانی تھی۔ آنحضرت صلعم نے انھیں خط لکھا کہ اگر مسلمان ہوئے تو انھیں ان کی بادشاہت پر برقرار رکھا جائے گا، ورنہ ان کے علاقے پر قبضہ کر لیا جائے گا۔ دونوں مسلمان ہو گئے۔ اس پر آنحضرت صلعم نے ان کے ہاں حضرت عمرو بن العاص کو بھیجا۔ (جنہیں ایک طرح مقیم سیاسی نمائندہ یا رزیڈنٹ کہا جا سکتا ہے)۔ اور مورخ بتاتے ہیں کہ مسلمانوں سے زکوٰۃ کی وصولی اور اسلامی مقدمات کا فیصلہ حضرت عمرو بن العاص سے متعلق تھے۔ باقی سارے امور میں جیفر و عبد خود مختار تھے۔

ایک سے زائد خود مختار مملکتیں خانہ جنگی کے ذریعے مسلمانوں میں بطور امر واقعہ پہلی صدی ہجری ہی میں وجود میں آ گئیں۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت اور حضرت معاویہ کے زمانے کے عام الجماعۃ (اتحاد کے سال) کے مابین سال ہا سال تک عملاً دو اسلامی مملکتیں رہیں۔ اس کے بعد اموی دور میں حضرت عبداللہ بن الزبیر کی حجازی حکومت بھی قابل ذکر ہے۔ بعد ازاں عباسیوں کی آمد پر اندلس مستقلاً الگ ہو گیا۔ رفتہ رفتہ خود مختار اسلامی مملکتیں روز افزوں ہوتی چلی گئیں۔ مجبوری کا کیا علاج ہ عباسی دور کے مختار فقہاء نے بالآخر فتویٰ ہی دے دیا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔

اتحاد اسلامی کا جذبہ عوام وخواص میں اب بھی برقرار ہے، لیکن ایک فردی خلافت اب ذرا دیر طلب نظر آتی ہے۔ البتہ ایسی مجلس خلافت جس کے ارکان اسلامی مملکتوں کے صدر ہوں، نسبتاً آسان حل ہے۔ اور اس میں سب کا فائدہ ہی نظر آتا ہے۔ نقصان کسی کا نہیں۔

اختیار سماعت (JURISDICTION)

اس سلسلے میں ذمیوں کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ نیز اس کا بھی کہ اجنبی مسافروں پر مسلمانوں کے قانون کا اطلاق نہیں ہوتا بلکہ ان کے ہم مذہب ذمیوں کے قانون کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ خصوصیت بھی قابل ذکر ہے کہ اسلامی تصور انصاف کے تحت ادنیٰ واعلیٰ میں کوئی فرق نہیں حتیٰ کہ صدر مملکت

بھی معمولی عدالت کے ماتحت سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ خلفاء راشدین کے دور سے لے کر ہمارے زمانے تک کے مسلمان حکمران کو ضرورت پر خود اس کی اپنی مملکت میں قاضی کے سامنے جواب دہی کے لئے آنا ایک معمولی واقعہ رہا ہے۔ غیر ملکی مہمان حکمران یا سفیر کی عزت تو کی جاتی ہے لیکن ان کا قانون سے بالا ہونا اسلامی نظام عدل گستری میں تسلیم نہیں کیا جاتا۔ (اگرچہ وہ آج مغربی قانون بین الممالک کے مسلّمات میں شامل سمجھا جاتا ہے)۔

سفارت | ماقبل تاریخ زمانے سے انسانی سماج میں پیام رساں پائے جاتے ہیں، لیکن مستقل سفیروں کا آغاز بہ ظاہر مسلمانوں ہی کے ہاں سب سے پہلے ہوا۔ اور یورپ میں اس کے کوئی دو سو سال بعد۔ جیسا کہ امیر علی نے (HIST. OF SARACENS میں) لکھا ہے۔ خلیفہ بغداد کے مستقل نمائندے "خود مختار" صوبوں کے موروثی والیوں کے دربار میں اور ان والیوں کے کارندے بغداد میں رہا کرتے تھے۔

سفارت کے ذریعے معاہدے بھی ہوا کرتے ہیں۔ اس بارے میں عیسائی اور اسلامی تصوّر میں بنیادی فرق ہے۔ پوپوں نے خاص کر پوپ چوتھے نکولاس نے فتویٰ دے رکھا ہے کہ غیر مذہب والوں سے جو وعدہ یا اقرار کیا گیا ہو، اس کی پابندی عیسائی پر واجب نہیں۔ اسلام (قرآن) نے اس کے برعکس وعدے کی پابندی اور معاہدے کی تعمیل کو ہر کسی کے ساتھ لازمی اور واجبی چیز قرار دیا اور عہد شکنی پر گناہ اور عذاب آخرت سے بھی ڈرایا ہے۔ ایک مشہور حدیث میں تو یہاں تک حکم ہے کہ "وفاء بغدر خیر من غدر بغدر" (دوسرے کی غداری کے باوجود عہد کا وفا کرنا بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ غداری کا جواب غداری سے دیا جائے)۔

جنگ | قانون جنگ ایک طویل داستان ہے۔ بعض پرانے مسلمان مؤلفوں نے اسے روا قرار دیا ہے۔ اور سماج کی بیماریوں کا آخری علاج، اس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ تعدّی اور حد سے تجاوز عمل میں نہ آئے اور قتل و خونریزی ناگزیر حد تک روا ہے۔ عہد نبوی میں دفاعی اور پیش بندی کی صرف دو طرح کی جنگوں کا پتہ چلتا ہے اور دشمن کو بھی اسلام قبول کرنے پر سارے گزشتہ جرائم سے معاف کر دیا جاتا ہے۔ لیکن چند ذیلی تفصیلیں بے محل نہ ہوں گی۔

اعلان جنگ ضروری ہے۔ ممکن ہو تو ہر لڑائی کے آغاز پر دعوت اسلام دی جائے۔ جنگ

کا اثر سابقہ واجبات پر نہیں پڑتا۔ مثلاً حالتِ امن میں کوئی اجنبی ہمارے ملک میں آئے اور اس کے اثناء قیام میں اس کے ملک سے جنگ چھڑ جائے تو اس کی چاہے نگرانی کی جائے لیکن نہ اس کو قتل و قید کیا جا سکتا ہے اور نہ اپنے وطن واپسی سے روکا جا سکتا ہے۔ ایسی واپسی کے وقت وہ اپنی ساری دولت اور جائداد بھی ساتھ لے جا سکتا ہے۔ اسی طرح ایک حدیث (السیف محّاءٌ للذنوب الا الدَّین) کے مطابق اجنبی کے واجب الادا قرضے اس سے جنگ چھڑنے کے باوجود منسوخ نہیں ہوتے۔ مال غنیمت انفرادی سپاہی کا حق نہیں ہوتا بلکہ ساری غنیمت یکجا کی جاتی ہے اور ساری فوج کو اس میں حصّہ دلایا جاتا ہے۔ (سپہ سالار اور سپاہی کے حصّے برابر ہوتے ہیں) حتیٰ کہ ان سپاہیوں کو بھی جو لشکر میں تو تھے لیکن لوٹ یا لڑائی میں شریک نہ ہوئے۔ ایک صحیح حدیث قابل ذکر ہے۔ کسی صحابی نے پوچھا کہ بعض لوگ اپنی بہادری کے دکھاوے کے لئے جنگ کرتے ہیں۔ بعض قومی عصبیت کے تحت وغیرہ۔ ان میں کون خدا کی راہ میں جنگ کرنا سمجھا جائے گا؟ رسول اکرمؐ نے جواب دیا: "صرف وہ جس کی غرض یہ ہو کہ خدا کا بول بالا ہو۔" (من قاتل لتکون کلمۃ اللّٰہ ھی العلیا۔)

یہ امر قابل ذکر ہے کہ اگر کوئی نبی خود جنگ کی نگرانی نہ کرے بلکہ دنیا دار اور بے دین بادشاہوں پر چھوڑ دے تو جنگ میں انسانیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ مسلمانوں کی خوش قسمتی ہے کہ ان کے پیغمبرؐ نے سپہ سالاری بھی فرمائی اور ایسا نمونہ بھی چھوڑا جو مسلمان بادشاہوں کے لئے واجب العمل ہے۔ اور ساتھ ہی انسانیت پرور بھی۔

غیر جانب داری آج کل عربی مؤلف اسے حیاد کہنے لگے ہیں۔ قبل اسلام کی عربی میں نیز قرآن و حدیث میں اس کے لئے اعتزال کی اصطلاح برتی گئی ہے۔ غیر جانبداری جب چاہے ختم کر کے جنگ میں شرکت تو کی جا سکتی ہے لیکن کوئی جنگ سابقہ معاہدے کی منسوخی کے اعلان اور فریق ثانی کو اطلاع دیئے بغیر شروع نہیں کی جا سکتی اور جب تک غیر جانبدار رہیں، غیر جانبداری کرنی چاہیئے۔ قرآن مجید میں تو "معاہدہ کئے ہوئے" ملک میں مسلمانوں پر ظلم ہو تو بھی غیر جانبداری کے زمانے میں غیر جانبدار رہنے کا عجیب و غریب حکم ملتا ہے۔

مشتے نمونہ از خروارے۔